عظمیٰ نور*

پروفیسر فتح محمد ملک کی اردو مزاحمتی شاعری کی تنقید

Abstract: *The purpose of criticism is to explain and analyse the work of art. Hence, it's utmost task is to make the life more creative. In this process, the critics are very much associated with political, social and psychological aspects of life. Consequently, the critic analyzes the creativity and the work of creative writers. Professor Fateh Muhammad needs no introduction in this regards as he is one of the most prominent figures in the contemporary artists. His uniqueness lies as he worked above any ideological bias. In his books, one can find true criticism on different issues. In his criticism on poetry, he preferred resistance poetry and he tested the humour of the resistant poets in a very significant manner.*

پروفیسر فتح محمد ملک نے نہ صرف نثر میں تنقیدی کارنامے سرانجام دیئے بلکہ انھوں نے شاعری میں بھی پورے خلوص اور ایمانداری کے ساتھ تنقیدی فریضہ سرانجام دیا۔ جتنی انہیں نثری تنقید میں کامیابی حاصل ہوئی اتنی ہی شہرت اور کامیابی انہیں شعری تنقید سے ملی۔ انھوں نے خاص طور پر ان شعراء کو موضوع بنایا جن کی شاعری میں مزاحمتی اثرات واضح ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ہم عصر مزاحمتی شعراء کی شاعری کا مبسوط جائزہ لیا ہے۔ ان شعراء میں سرفہرست وہ جس شاعر کی صلاحیتوں کا دم بھرتے نظر آتے ہیں وہ فیض احمد فیض ہیں۔ فیض کی انقلابی شاعری اور اشتراکی عقائد کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

> ”فیض طبعاً ایک غنائی شاعر ہیں اور ندرت احساس تازگی اظہار اور رنگینی تخیل سے انھوں نے اردو کی غنائی شاعری میں جن عناصر کا اضافہ کیا ہے وہ سب اسی دور کی شاعری میں موجود ہیں۔“(۱)

فیض ناآسودگی اور بے اطمینانی کے دور کے شاعر ہیں۔ ان کے سامنے ایک طرف دم توڑتا پرانا سماج ہے جبکہ دوسری طرف نئے نظام کی ابھرتی ہوئی قدریں تھیں۔ یہی وقت تھا جس میں نئی نسل سے پرانی اقدار چھوٹ رہی تھیں اور نئی اقدار ان کی جگہ لے رہی تھیں۔ اس تصادم نے ایک کشمکش کی صورت حال پیدا کر رکھی تھی۔ فیض اس تصادم اور تشکیک کا شکار نہیں تھے بلکہ انھوں نے نئے نظام کو ذہنی طور پر قبول کر لیا تھا۔

* گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول اے آر ایل مارگاہ، راولپنڈی

وہ نئے نظام کے فروغ کے لیے پرانے نظام اور ملک میں تبدیلی چاہتے تھے۔ انھوں نے انقلاب کے نعرے ایک اعتدال اور توازن کے ساتھ لگائے۔ وہ بڑے رکھ رکھاؤ اور وضع دار شاعر تھے۔ ان کے نرم لہجے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کہیں قریب سرگوشیاں کر رہے ہوں۔

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن وصوت ہزار کا موسم (۲)

رومان اور انقلاب کی کشمکش فیض کی شاعری کا خاصہ ہے۔ وہ پیشانی، ہونٹ اور رخسار کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں۔ عین اسی وقت وہ غریبوں اور دردمندوں کی حمایت میں سوچنے لگتے ہیں۔ صحیح سمت کا فیصلہ کرنا ان سے مشکل ہوتا رہا۔ ان کی زبان پر انقلاب کا نعرہ ہے مگر دل رومان سے بھرا ہے۔ قید وبند کی صعوبتوں کے اثرات فیض کی نظموں "زنداں کی ایک صبح"، "دریچہ"، "درد آئے گا دبے پاؤں" میں صاف دکھائی دیتے ہیں۔ فیض مصحفی سے لے کر حسرت تک کسی شاعر کی جانشین یا مقلد نہیں وہ ایک منفرد طرز احساس کے سہارے ماورائیت کے بجائے ارضیت کی روایت کو آگے بڑھانے والے شاعر ہیں۔

پروفیسر فتح محمد کے خیال میں اشتراکی عقائد سے دستبردار ہوتے ہی ان کی لذت کے کرب میں پیچ وتاب دکھاتی آواز میں امید پرستی کا سایہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ انفرادیت پسندی کا احساس بھی ان میں باقی نہیں رہتا۔ سیاحتِ قلب کی شاعری مقصدی شاعر پر غالب آجاتی ہے۔ ان کی نظمیں "شام"، "ملاقات مری"، "کہاں جاوگے" اور "منظر" تخلیقی غور وفکر سے معمور نظر آتی ہیں۔ فیض کو ہمیشہ اپنی محرومیاں اور ناکامیاں معاشرے کی محرومیاں اور ناکامیاں نظر آتی رہیں۔ چنانچہ ان کے داخل وخارج میں محبت کے جھرنے پھوٹ پڑے۔ انھوں نے لیلائے وطن کو بھی اپنے محبوب کی طرح چاہا۔ فیض کو ذہنی کیفیات کی تصویریں لفظوں سے بنا دینے میں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ ان کی شاعری میں ربط، احساسات کی نزاکت اور حزن ایسی خصوصیات ہیں جنھوں نے اردو شاعری میں انھیں اعلیٰ مقام عطا کیا۔ مظلوم انسانیت کے دکھوں کا شعور ہمیں فیض کے ہاں ملتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری کا عہد نو فیض کا عہد ہے۔ پروفیسر جمیل احمد لکھتے ہیں:

"طبقاتی کشمکش کے خلاف انقلاب اور جدوجہد تیسری دنیا کے استحصال زدہ عوام، مزدوروں اور کسانوں کے حقوق چند ایسے موضوعات ہیں جن پر فیض نے بہت لکھا ہے اور اس انداز سے لکھا ہے کہ ان کی شاعری کھوکھلی نعرے بازی بننے کے بجائے بامعنی اور جامعیت کی تمام تر وسعتیں اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔"(۳)

فیض کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر فتح محمد ملک نے فیض کے معروضی حالات کو بہت حد تک پیش نظر رکھا ہے، جس سے ان کی تنقید میں معروضیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

احمد فراز نئی نسل کے ساتھ ترقی پسند تحریک کے راستے پر گامزن ہونے والوں میں سرفہرست ہیں۔ اس بات کا اندازہ ان کے پہلے مجموعہ کلام سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے جس میں وہ حفیظ جالندھری، ن م راشد اور باقی صدیقی سے لے کر ناصر کاظمی تک سب سے گہرے اثرات قبول کرتے نظر آتے ہیں۔ احمد فراز کی ترقی پسندی دراصل مقامیت سے پھوٹتی نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ندیم کی روایت سے منسلک ہو کر مقامیت سے آفاقیت کا سفر بڑی تیزی سے کیا ہے۔ فیض احمد فیض "تنہا تین" کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

> "وہ شاعری ہے شعر کی تلاش نہیں ہے جس میں خیال اور جذبے کا قالب اور شعر کا لباس الگ الگ دکھائی نہیں دیتے آپس میں پیوست ہیں۔"(۴)

احمد فراز ایک ایسا شاعر تھا جس کو ہمیشہ جھوٹی مذہبیت اور ریاکار تاجروں سے اختلاف رہا۔ انھوں نے سلاطین وملوک کے دست ستم پر بیعت نہ کر کے رومانی تاریخ کے تسلسل کو برقرار رکھا۔ وہ جھوٹی رومانیت اور نمائشی وطن پرستی کے خلاف رہے اور سچی و حقیقی رومانیت جس میں وطن سے سچی محبت ہو اس کا پرچار کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے وطن کی شان میں جھوٹے قصیدے لکھنے کے بجائے وطن کی آزادی وخود مختاری اس کی بقا، عدل وانصاف پر مبنی معاشرے کی اہمیت پر زور دیا وہ ایک بیدار دل ودماغ کے مالک تھے۔ پروفیسر فتح محمد ملک نے احمد فراز کی شاعری کے اس پہلو کو اپنی تنقید میں بہت حد تک واضح کیا ہے۔

احمد فراز نے اپنے فنی سفر کا آغاز ترقی پسند ادبی تحریک سے کیا۔ گزشتہ ربع صدی کے دوران فراز نے ہر طرح کے احتساب سے بے خوف ہو کر لکھا۔ ترقی پسندی سے تخلیقی وابستگی کا جو معیار فراز نے قائم کیا وہ لطف سخن اور قبول عام ہر دو لحاظ سے قابل قبول اور قابل رشک ہے۔ وہ اپنے پہلے مجموعہ کلام "تنہا تنہا" کی پہلی نظم میں یہ عہد کرتے ہیں کہ:

اب مرا ہنر ہے مرے جمہور کی بدولت
اب میرا جنوں خائف تعزیر نہیں ہے
اب دل پہ جو گزرے گی وہ بے ٹوک کہوں گا
اب میرے قلم میں کوئی زنجیر نہیں ہے (۵)

زندگی کی ناہمواریاں اور سفاکیاں جو معاشرے میں موجود تھیں ان کی تلخ نوائی کے باوجود فراز نے انہیں اپنی شاعری میں خوبصورت اور پر ثروت انداز میں پیش کیا۔ ان کی نظر ابتدا میں ہی قومی زندگی اور محبوب پر مرکوز تھی جب وہ ترقی پسند ادب کی راہ پر آئے تو شرربرقی کی صورت میں وارد ہوئے مگر بعد میں انھوں نے جلد ہی شرربرقی کا لبادہ اتار پھینکا اور احمد فراز بن گئے۔ مگر شاعری میں ان کا رشتہ برقی کے ساتھ ہمیشہ رہا۔

بقول پروفیسر فتح محمد ملک فراز نے اپنی شاعری میں شہر اور شہریار کے استعارے استعمال کیے ہیں جو دراصل سیاسی رمزیت لیے ہوئے ہیں۔ ان کی نظمیں جلاد، چلو اس شہر کا ماتم کریں، ہم اپنے خواب کیوں بیچیں اور محاصرہ حقیت شناسی کا مظہر ہیں۔ ان نظموں کے

ذریعے وہ غفلت میں ڈوبے لوگوں کو آنے والے خطرات سے آگاہ کرنا چاہ رہے ہیں۔ اس عذاب سے ڈرانے کی کوشش کر رہے ہیں جو ہماری سرحدوں پر موجود ہے۔ اگر حالات کو مد نظر رکھ کر دیکھا جائے تو اندازہ ہو گا کہ انھوں نے ایک سچے شاعر کا فریضہ ادا کیا ہے۔

مزاحمتی شعراء میں احمد ندیم قاسمی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔اسی بنا پر یہ بھی پروفیسر فتح محمد ملک کی توجہ کا مرکز بنے۔انھوں نے سقوط ڈھاکہ پر جس رد عمل کا اظہار کیا وہ اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ انہیں اپنے وطن سے بے پناہ محبت ہے۔ پاکستان بننے کے بعد قومی احساس ندیم کی شاعری میں جابجا ملتا ہے۔ اس بات کی بہترین غماز ان کی نظم "غم وطن" ہے۔ ۱۹۷۱ء کے واقعات نے ندیم کی ذات کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کا اظہار ان کی اس دور کی شاعری سے بخوبی ہوتا ہے۔ اس دکھ اور اذیت نے ان میں رجائیت لوٹا دی اور انھوں نے اپنی نظموں "اگر ہے جذبہ تعمیر زندہ" اور "دوستو آؤ" میں ایک نئے مستقبل کی تعمیر کا ارادہ باندھا۔ یہی وہ وقت تھا جب انھوں نے محنت اور لگن سے جینے کا درس دیا اور ذلت کی زندگی سے موت کو بہتر سمجھا۔ پاکستان کے جب دو ٹکڑے ہوئے تو اس دکھ نے ندیم کی شاعری میں ایسی گہرائی پیدا کی جس میں آباؤ اجداد کے خوابوں کی اس سرزمین میں عزت کے ساتھ جینے کا ہنر سکھایا۔ سقوط ڈھاکہ ایسا المیہ تھا جس نے ان کے ذہن و دل پر بے حد اثر ڈالا۔ اس کے بارے میں ندیم لکھتے ہوئے مخلوق خدا کے ساتھ ساتھ رب کائنات سے بھی مخاطب ہوتے نظر آتے ہیں:

جس سے ہم تقسیم ہوئے نسلوں اور زبانوں میں
حائل ہیں کتنے آیئنے ، آپس کی پہچانوں میں
جس سے ایک چڑیا نے شیر کو بچھاڑا ہے
فاختہ کی آنکھوں میں قاتلوں کے تیور ہیں
شان جمہور تو جب ہے کہ ہر انسان کہے
میرا حاکم میرا ہر حکم بجا لاتا ہے (۶)

ندیم کی شاعری میں ہمیں اپنی تہذیب کی بنیادی اقدار پر اٹوٹ اعتماد نظر آتا ہے۔ وہ دور حاضر کی فکری و فنی تحریکوں کے منفی رجحانات سے متاثر ہوئے بغیر ایسا سوز و کرب رکھتے ہیں جس میں ان کا لہجہ ہمیں توانا اور دل گداز نظر آتا ہے۔ اگر ندیم کی شاعری کے مقاصد کو دیکھیں تو وہ فکر سخن اور تخلیق شعر کی کیفیت کے آہنہ دار ہیں۔ شاعری ہو یا افسانہ ندیم کے پاس موضوعات کی بھرمار ہے۔ وہ کچھ مخصوص موضوعات پر اکتفا کرنے والا شاعر نہیں ہے۔ ان کی شاعری افسانے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنی۔ اس سلسلے میں وہ خود لکھتے ہیں:

"میری شاعری کو افسانہ نگاری نے اور افسانہ نگاری کو شاعری نے نکھارا ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ میں شاعر اور افسانہ نگار ہی کیوں ہوں ساتھ ہی مصور، مغنی اور مجسمہ ساز کیوں نہیں ہوں۔ میرے اندر تو تخلیق فن کا لاوا ابل رہا ہے۔"(۷)

پروفیسر فتح محمد ملک نے احمد ندیم قاسمی کی شاعری کے معروضی پہلوؤں کو ان کے عہد کے حالات کے تناظر میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

پروفیسر فتح محمد ملک کے خیال میں منظور عارف ایسا مزاحمتی شاعر ہے جو اسلام اور ملوکیت کے فرق کو سمجھتا ہے۔ جاگیرداروں، سرمایہ داروں، افسر شاہی پاکستان کے جو حالات بنا رہے تھے ان سے خوب واقف تھے۔ اصل میں ان کی ذہنی وادبی تربیت ترقی پسند تحریک کے سائے میں ہوئی۔ اگر ان کے ابتدائی دور کا کلام دیکھیں تو اس میں موجود فنی پختگی سے حیرت ہوتی ہے۔ ترقی پسند طرز فکر کی نمایاں چھاپ ان کے ہاں صاف دیکھی جاسکتی ہے۔ منظور عارف کو اپنے دور کے شعراء سے الگ اور ممتاز کرنے والی چیز قومی تاریخ کے ساتھ ان کی وابستگی ہے۔ معاشرے میں برپا طبقاتی کشمکش وہ اپنے شعور کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ محروم اور مظلوم طبقہ، محنت کشوں کے ساتھ ظلم انھیں قلم اٹھانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ وطن سے محبت کی بہترین عکاس ان کی نظم "جمخانہ کلب" ہے۔ اصل میں یہ نظم ۱۹۶۵ء کی جنگ کے پس منظر میں لکھی تھی۔ جب جنرل چوہدری کلب میں شام منانے کا ارادہ کرتا ہے تو عارف مذہبی روایات اور ملکی حالات کو سامنے رکھ کر یہ نظم لکھتے ہیں:

شہر لاہور میں جمخانہ ہی جمخانہ نہ تھا
اس میں داتا بھی تھا اقبال بھی پیمانہ ہی پیمانہ نہ تھا
اہل دل بھی تھے قلندر بھی تھے اور درویش بھی تھے
جنہیں کچھ اور مرحلے درپیش بھی تھے۔(۸)

بچپن اور جوانی کا دور عارف کی زندگی کا حسین ترین دور تھا۔ اس کے بعد ملازمت سے برطرفی والد کی وفات، زندگی کے بدلتے حالات وواقعات نے انہیں زودرنج کر دیا۔ وہ انسان کو مادی اور روحانی ہر دو طرح سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ ویت نام، یکم مئی، قبلہ اول اور وٹو پاور ایسی نظمیں ہیں جنہیں عصری سیاق وسباق کے ساتھ انھوں نے لکھا۔ ان کی نظموں کا بغور جائزہ لیں تو اس میں سیاسی شعور، احساس جمال اور مابعد الطبیعاتی طرز فکر اکٹھے نظر آئیں گے۔ منظور عارف کی فنی فکر کا راز ان تینوں عناصر میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ن م راشد نے شعور کی آنکھ کھلتے ہی ۱۹۰۵ء کے روس اور جاپان کے بحری بیڑوں کی جنگ دیکھی جس میں جاپان کو فتح ملی اگرچہ وہ طاقت میں ان سے کم تھا۔ یہاں سے راشد نے سوچا کہ وہ اپنے دشمنوں کو شکست دے کر خود آزادی کے علمبردار کیوں نہیں بن سکتے۔ آزاد نظم کا آغاز کرنے والوں میں میراجی اور ن م راشد کا نام قابل ذکر ہے۔ ابتدا میں انہیں مذاق کا نشانہ بنایا گیا مگر بعد میں ترقی پسند تحریک کے شعراء نے بھی یہی وطیرہ اپنا لیا۔ راشد کو ایک باغی شاعر قرار دے دیا جاتا ہے۔ یہ بغاوت مختلف صورتوں میں نظر آتی ہے۔ انھوں نے محبت کے مروجہ مشرقی تصور سے بغاوت کی۔ انھوں نے اپنی نظموں "جال"، "گناہ"، "اتفاقات" میں محبت کی مسرت کو گناہ کی لذت تک محدود کر دیا۔ اس کے غلاوہ غیر ملکی استعمار اور غاصب واجنبی حکومت کے خلاف نفرت اور سرکشی ہے۔ یہی وہ زاویہ ہے جو ان کی شاعری کا

اہم ترین عنصر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ن م راشد نے نہ صرف غیر ملکی تہذیب وحکومت کی مذمت کی بلکہ دشمن سے بدلہ لینے کے لیے انھوں نے ایک سپاہی کی طرح کردار ادا کیا۔

وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

ایک لمحے کے لیے دل میں خیال آتا ہے
تو میری جان نہیں ہے
بلکہ ساحل کے کسی شہر کی دوشیزہ ہے
اور تیرے ملک کے دشمن کا سپاہی ہوں میں (۱۰)

راشد کا دور مسلمانوں اور ہندوئوں کی سیاسی غلامی کا دور تھا۔ جس میں سماجی قوتیں غالب تھیں۔ حریت پسند مغلوب تھے۔ ہر طرف افراتفری کا سماں تھا۔ دن رات گرفتاریاں ہو رہی تھیں۔ آزادی کی خاطر جنگ جاری تھی۔ جلیانوالہ باغ، مسجد شہید گنج، مسجد کانپور خونی واقعات سے بھری تھیں۔ یہی وہ حالات تھے جن کے اثرات سے راشد بھی متاثر ہوا اور ان میں شدید احتجاج کے اثرات پیدا ہوئے۔ ان استحصالی رویوں کی مذمت اور ظلم کے خلاف راشد نے آواز اٹھائی۔ مسلمانوں کی بدحالی اور معاشی ومعاشرتی حالات کی خرابی ان کی نظموں کا موضوع بنی۔ راشد کی شاعری آغاز سے لے کر آخر تک استحصالی نظام سے متعلق ہے۔ سامراجی استحصالی رویوں نے انسانوں کی زندگی تباہ کر رکھی تھی۔ اقتصادی اور سیاسی ہمہ گیر وملکی غلامی نے برصغیر کے ذہنوں کو قابو کر رکھا تھا۔ راشد ان حالات کے ساتھ ساتھ تیسری دنیا کے مختلف ممالک کے استحصالی نظام سے بھی دلبر داشتہ تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ جس دور میں اور جن حالات میں ہم زندگی گزار رہے ہیں یہ انسانی پستی کا بدترین دور ہے۔

پروفیسر فتح محمد ملک کے جائزے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ منیر نیازی کی شاعری میں اقبال کی شاعری کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تحریک پاکستان کے خوابوں کو عملی زندگی کا حصہ دیکھنا چاہتے تھے۔ منیر خدا کی اس سرزمین پر ستم کا طوفان دیکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک کی فضائوں پر آسیب کے سائے ہیں۔ صداقت کا دور دور تک نام ونشان نہیں جبکہ جھوٹ ہر طرف عام ہے۔ زمین پر فساد برپا ہے۔ کسی طرف امن وسکون نہیں۔ انہیں ہر طرف طوفان کے آثار نظر آرہے ہیں۔ ان حالات میں وہ اپنے رب کی طرف رجوع کرتے نظر آتے ہیں۔ خدا اور رسولؐ خدا کو یاد کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ان حالات کا ذکر بہت سے اقبال کے اشعار کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔

منیر نیازی کی نظر میں پاکستان کے بنانے کا مقصد ایک ایسے ملک کا قیام تھا جو کوفہ وبغداد سے ہٹ کر ہو ایک ایسا وطن جس میں محمدؐ کے نام کا اجالا ہو کیونکہ اہل کوفہ وبغداد اس کام میں ناکام ہو چکے تھے۔ بحیثیت شاعر منیر اسم محمدؐ سے اجالا کرنے کے خواہاں تھے۔ مگر تحریک پاکستان کے اس خواب کو سب فراموش کر چکے تھے اور زر پرستی کے خواب دیکھتے دیکھتے ہم افلاک سے خاک پر آ گئے تھے۔

چمک زر کی اسے آخر مکان خاک میں لائی
بنایا ناگ نے جسموں میں گھر آہستہ آہستہ (۱۱)

منیر نیازی کو اس بات کا دکھ ہے کہ ہم جو کوفہ و بغداد سے دور اسم محمدؐ کی روشنی میں نئی بستیاں آباد کرنے آئے تھے مگر ہم اپنی راہ سے ہٹ کر پھر انہی راستوں پر چلنے لگے ہیں۔ اس بات کا اظہار انھوں نے جابجا اپنی نظموں میں کیا ہے۔ وہ اس زوال زدہ معاشرے میں خود کو ایک اجنبی محسوس کرتے ہیں۔ عیش کی فراوانی اس قدر ہے کہ اس نے انسان کے دل سے ہر طرح کا خوف ختم کر دیا ہے۔ اس صورت حال میں منیر کا دل یادِ مصطفیٰؐ میں گم ہو کر رہ گیا ہے۔ پاکستان کے لیے دیکھے گئے خوابوں کی روشنی میں پاکستان ایک نئی زندگی کی تعمیر اور ایک نئی دنیا کی تخلیق سے غافل ہے جس کا اظہار وہ اس شہر آشوب سے نجات کے لیے ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

بیٹھ جائیں سائیہ دامانِ احمدؐ میں منیر
اور پھر سوچیں وہ باتیں جن کو ہونا ہے ابھی

اس جائزے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پروفیسر فتح محمد ملک کا انداز تنقید معروضی ہے کیونکہ وہ اس عہد کے حالات کے بہت حد تک چشم دید رہے ہیں اسے لیے ان کے مطالعے اور تجزیے معروضی نوعیت کے ہیں۔ وہ ترقی پسند شعراء کی فکر ،مساعی اور عملی انجام سے واقف و آگاہ نقاد ہیں۔ میدان سیاست، اقلیم ادب، نظم ریاست اور ترتیب معاشرت سب پروفیسر فتح محمد ملک کے نظام فراست کے روشن باب خیال کیے جاسکتے ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، تعصبات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۱ء، ص ۲۵۲
۲۔ حمید اللہ، نظم، العلم پبلشنگ سروسز، پشاور، ص ۱۲۱
۳۔ ایضاً، ص ۱۳۷
۴۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، اندازِ نظر، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۱۵۳
۵۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، تحسین و تردید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۱۵۲
۶۔ ایضاً، ص ۱۴۸
۷۔ افکار، ندیم نمبر، ص ۲۶۷
۸۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، تحسین و تردید، ص ۱۳۷
۹۔ حمید اللہ، نظم، العلم پبلی شنگ سروسز، پشاور، ص ۱۶۰
۱۰۔ ایضاً، ص ۱۶۰
۱۱۔ فتح محمد ملک، پرفیسر، خیال و خواب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۱۹۷